جدید ناروی فلسفہ — مستقبل کی سمت پیش قدمی کا جنون

بارن جی سکر بک / جیوڈتھ لارسن / ڈاکٹر خالد الماس

پس منظر

دوسرے ممالک کی طرح ناروے میں بھی فلسفہ ایک بار پھر سے زبان زد خاص وعام ہے۔ اشاعتی اداروں سے اخبارورسائل تک یہ چلن واضح دکھائی دیتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک طویل فکری دور کا خاتمہ ہو گیا ہے جس نے یہ تاثر چھوڑا کہ جدید معاشرے کو دَر پیش گھمبیر سوالات کے جواب محض سیاسی اور کاروباری فضا میں نہیں ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ ساٹھ اور اوائل ستّر کی دہائی میں ناروے میں فلسفے سے دلچسپی محض ماؤنوازوں (Maoists) کی سیدھی سادی سوچ تک محدود تھی۔ بعد ازاں، یہ کاروباری روشن خیالوں کے ہاں پروان چڑھی، جسے عوامی حلقوں کے سنسنی خیز رجحانات سے مزید پذیرائی ملی۔ یہ وہ دَور تھا جب مشکل سوالات اُٹھانے کی بجائے، آسان جوابات دینے کو ترجیح دی جاتی، مگر مغالطہ آمیز سوچ کی مدت طویل نہیں ہوا کرتی۔ سطحی فکر کا وقت گذر چکا، اب سنجیدہ بالغ نظری کی ضرورت ہے۔

بطور پیشہ فلسفہ سے وابستہ حضرات کے لیے ایسی نئی تبدیلی بہت معنی خیز ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آج فلسفہ میں دلچسپی معروف فلسفیانہ نظریوں کے مابین محض ایک پینڈولم کے ناچ کی طرح نہیں جہاں ایک نظریے سے دوسرے نظریے کی طرف رغبت رکھی جاتی ہے اور بس۔ آج کے جدید معاشرے میں فلسفے کی پشت پر سائنس کی صورت میں ایک بندر سوار ہے۔ دراصل، نوبہ نو سائنسی تناظر میں دنیا کو دَر پیش خطرات، زندگی کے بدلتے ہوئے طور اطوار اور اقدار کی وجہ سے انسانوں کی رہنمائی کی ضرورت بڑھ گئی ہے۔ یہ خطرہ حقیقت لگنے لگا ہے کہ کرۂ ارض اب انسانوں کے لیے ایک محفوظ مسکن نہیں رہا۔ اِس لیے ہم جدید دَور کے زمینی حقائق سے نظریں نہیں چُرا سکتے۔

آج سائنسی فکر کے بارے میں سنجیدگی سے غور و فکر کرنا وقت کا تقاضا ہے۔ اس پر ناقدانہ بحث ہونی چاہیے۔ اس کے متعلق یک طرفہ نقطۂ نظر اپنانا، کسی طور بھی مناسب نہیں۔ ضرورت اِس اَمر کی

ہے کہ سائنسی فکر سے متعلق مباحث بیک وقت جدید ترین سائنسی خدمات اور فلسفیانہ بصیرت کے حامل ہوں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ ایسے مباحث کے قطعی نتائج کبھی سامنے نہ آپائیں گے، مگر اِن کی وجہ سے فکر و نظر کی سطح ضرور بلند ہو گی اور فکری کج رویوں میں کمی آئے گی۔ اِس تناظر میں دیکھا جائے تو یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ فلسفیانہ مباحث جدید معاشرے کی جائز اولاد ہیں۔ اِس حوالے سے، فلسفہ جدید دنیا کو دَر پیش کسی بھی بحران سے نپٹنے کے لیے ایک فوری سکون کا دَرمان بن سکتا ہے۔

آج فلسفے میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کا کم از کم ایک سبب یہی ہے جسے ہم دیکھ رہے ہیں۔ ایک خاص حد تک شاید یہ تناظر خود اپنی جگہ بہت اہمیت کا حامل ہو، لیکن ہم گمان کر سکتے ہیں کہ جدید معاشرے میں کسی بھی شکل میں فلسفے میں دلچسپی کبھی ماند نہیں پڑے گی۔

اس حوالے سے، ناروے بھی اِس سے مُبّرا نہیں۔ لیکن اگر ہم اس ملک کی مخصوص صورتِ حال کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے بات کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اِس ملک میں فلسفے کا حال ماضی کی بہ نسبت آج کہیں زیادہ بہتر ہے۔ آج جملہ نارڈیائی (Nordic) یونیورسٹیوں کے مقابلے میں ناروی (Norwegian) یونیورسٹیوں میں تمام طلبہ کو فلسفہ کا ایک ابتدائی کورس لازماً پڑھنا ہوتا ہے، جسے "فلسفے کا امتحان" (examen philosophicum) کہا جاتا ہے۔ ناروے نے یہ نظام ڈنمارک سے مستعار لیا جو خود ڈنمارک نے جرمن یونیورسٹیوں کی روایت سے متاثر ہو کر اپنایا تھا، لیکن دوسرے نارڈیائی ممالک نے اِسے بعد ازاں تیاگ دیا۔ اِس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ناروی معاشرے کی فلسفیانہ فضا یورپی معاشرے کی فلسفیانہ فضا اور دیگر شعبۂ علوم کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اوسلو (Oslo) یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ میں ساٹھ سے زیادہ فلسفے کی مستقل اسامیاں موجود ہیں، جس کی وجہ سے یہ دنیا کے بڑے شعبوں میں سے ایک شمار کیا جاتا ہے۔ برگن (Bergen)، ٹرونیڈ ہیم (Trondheim) اور ترومشو (Tromsø) میں کوئی بیس کے قریب اسامیاں موجود ہیں جو کہ اتنی تھوڑی بھی نہیں، بشر طیکہ اُن کا موازنہ بین الاقوامی سطح پر کیا جائے۔ علاوہ ازیں، کچھ علاقائی کالجز جیسے بوڈو (Bodø)، بوَ (Bø)، کرسچین سینڈ (Kristiansand)، للّی ہیم ((Lillehammer اور ستاوینگر (Stavanger) میں بھی اب مستقل اسامیاں پیدا کی گئی ہیں۔ اِن اِداروں میں نہ صرف بہت سے فلسفی ہیں بلکہ ان میں سے کئی تو عوام میں بھی مقبول ہیں۔ جنگِ عظیم کے بعد اِن فلسفیوں نے مختلف حوالوں سے اپنی پہچان بنائی ہے۔

بہر حال اب تک جو کہا، سو کہا۔ اچھا رہے گا اگر یہاں اُن مشکلات کو یاد کر لیا جائے جو اس ملک کے

فلسفیوں کو ابتدائی دِنوں میں اُٹھانا پڑیں۔ ۱۸۱۳ء سے جنگِ عظیم دوم کے بعد، اوسلو (Oslo) میں رائل فریڈرک یونیورسٹی (Royal Frederiks University)، ملک کی وہ واحد یونیورسٹی تھی جس میں اوسطاً فلسفے کی صرف ایک اسامی موجود تھی۔ مزید بر آں، ناروے کے بانی حضرات میں سے ایک طاقتور سیاست دان اور یونیورسٹی کے ترجمان انٹون مارٹن شویگارڈ (Anton Martin Schweigaard) نے ۱۸۳۰ء میں یونیورسٹی میں فلسفے کو بامر مجبوری قایم رکھا ہوا تھا۔ وہ ملک اور یونیورسٹی کو جدید خطوط پر استوار کرنے کا خواہاں تھا۔ اس کے نزدیک، مفید سائنسی اور عملی مضامین (جیسے شماریات اور برطانیہ کی قومی معاشیات) کو فلسفیانہ قیاس آرائیوں اور غیر مروّجہ زبان پر ترجیح دی جانی چاہیے۔ جہاں بالخصوص جرمن فلسفے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ۱۸۳۵ء میں ۲۶ سال کی عمر میں اُس نے یہ بغض نکالا تھا کہ "جرمن فلسفہ بہت سی برائیاں کر چکا، بہت سے فطین ذہنوں کو بھٹکا چکا، اب وقت آ گیا ہے کہ اس کا کچھ کیا جائے۔" بہت حد تک وہی ہوا جو شویگارڈ (Schweigaard) نے چاہا تھا۔ مادی اور ثقافتی، ہر دو لحاظ سے ملک کو ترقی کی ضرورت تھی۔ کام بہت بڑے تھے اور بالکل واضح تھے۔ وہ دقیق سوالات اُٹھانے کا وقت نہ تھا۔ یہ وہ دور تھا جب لکھاری اور پادری روحانی مسائل کے بارے میں غور و خوض کر سکتے تھے، لیکن فلسفیوں کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

اس وجہ سے (ہم کہہ سکتے ہیں) ہمارا ملک اپنے پیروں پر کھڑا ہوا، یہاں تک کہ ۱۸۱۴ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک، دُنیا کی طاغوتی طاقتوں کے ساتھ اس کی پہلی اہم ملاقات طے پائی۔ وقتی مزاحمتوں اور مصائب کے باوجود ہمارا ملک سماجی بندھنوں کو توڑتے ہوئے باہمی تعاون کے باعث قایم ہو گیا۔ اس میں ایک عملی اورافادی جذبہ موجزن ہو گیا۔ لکھاریوں نے لکھا، مبلغوں نے تبلیغ کی اور حکومتی کارپردازوں نے فلسفیانہ سوالات سے گہری رغبت کو پھر سے اُبھارا۔ اب وقت آن پہنچا ہے کہ خرافات چھوڑ دی جائیں۔ (جیسے خیال کیا جاتا ہے کہ تقریباً ۱۹۰۵ء میں، سویڈن کے ساتھ جاری کشمکش کے آخری دور میں کرسچین مائیکل سین (Christian Michelsen) نے بجورشٹرنے بجورنسن (Bjørnstjerne Bjørnson) کو یہی کہا تھا۔

اِن معنوں میں، ہم نے ادبی اور سیاسی رنگ میں رَنگی ترقی یافتہ ثقافت کو تو حاصل کر لیا لیکن اس میں فلسفیانہ رنگ نہ آ سکا۔ مثال کے طور پر، سیکنڈری سکول کی سطح پر ہمیں ہندوستان کی غذائی صورتِ حال جیسے مفید اور ظاہری طور پر کارآمد عنوانات کے بارے میں مضامین لکھنے سکھائے گئے لیکن روحانی اور سرّی علوم جیسے گنجلک مضامین کے متعلق کچھ نہ سکھایا گیا، مثلاً جو اُن طلبہ کے لیے ضروری تھے جو

فرانسیسی بیچلرشپ کے لیے پڑھ رہے تھے۔ ناروی لوگ عملیت پسند تھے، غالباً شاعر بھی تھے اور مذہبی بھی۔ لیکن فلسفیانہ ذوق کے حامل نہ تھے! انھوں نے خود کو فطری گردانا، حالانکہ دوسروں کے لیے وہ اجنبی ہی رہے۔

شیوگارڈ (Schweigaard) کا ساتھی، اٹارنی ونجے جو بحیثیت شاعر ا سمنڈا ونجے ولاؤسن (Aasmund Vinje Olavsson) زیادہ مشہور ہے.... نے واضح طور پر یہ جان لیا تھا کہ شیوگارڈ (Schweigaard) نے نہ صرف جرمن فلسفہ کی اینٹ سے اینٹ بجائی بلکہ جملہ فلسفہ کو گزند پہنچایا۔ وہ اپنے ملک کو جرمنی کے مابعد الطبیعیاتی فلسفے سے دُور اور فرانسیسی و انگریزی فلسفۂ استقرا سے قریب کرنا چاہتا تھا۔ دراصل، وہ ہر طرح کے نام نہاد فلسفے سے بُعد رکھنے کا خواہاں تھا تاکہ اُس کے "تحلیلی و تشریحی طریقۂ کار" (analytic-descriptive method) کے علاوہ کسی کو بھی خاطر میں نہ لایا جا سکے۔ وہ عملی نوعیت کی عقلِ سلیم یا فہمِ عامہ کا شیدائی تھا اور خود کے ہاتھوں سے جو چھوا نہ جا سکے، اُس کے ماسوا ہر طرح کی فکر کو دَرخورِ اعتنا نہ سمجھتا تھا۔ اُس کے نزدیک، صرف تجربہ پر مبنی فکر ہی اس قدر واضح، عملی، سودمند اور حقیقی ہونی چاہیے کہ جس کا کوئی کَنارہ نہ ہو۔

احیا: ایک نیا تصفیہ

جب ستائیس سالہ نوجوان آرنے نیئس (Arne Næss)، جو گاہِ دانشمندی کے طور پر مشہور ویانا (Vienna) سے نیا نیا اپنے وطن پہنچا تھا، نے ۱۹۳۹ء میں اوسلو (Oslo) یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ میں پیشہ وارانہ طور پر اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں، ناروی فلسفہ میں تبدل آیا۔ نئے دلائل و براہین کی ضرورت پر زور دینے اور اصلی و حقیقی نوعیت کے فلسفیانہ موضوعات کو اُٹھانے اور مروّجہ تعلیمی ڈھانچے کی ظاہری وضع قطع سے بیزاری ظاہر کرنے کے سبب اپنے غیر رسمی طرز کی بنا پر نیئس (Naess) نوجوانوں میں مقبول ہوا جن میں سے زیادہ تر فلسفی، اگرچہ نفسیات اور سماجی علوم کے لوگ بھی، اُس میں شامل تھے، جیسے، ویلہلم آوبرٹ (Vilhelm Aubert)، ایلسی بارتھ (Else Barth)، میابرنر (Mia Berner)، نلز کرسٹی (Nils Christie)، انگیمنڈ گلووگ (Ingemund Gullvåg)، آرلڈ ھالینڈ (Arild Haaland)، ہاریلڈ اوفستاد (Harald Ofstad)، سٹائن روکان (Stein Rokkan)، راگنار رومیتویٹ (Ragnar Rommetveit) اور ہرمان ٹونیسن (Hermann Tønnessen)۔

ویانا میں نیئس (Naess) نے وائنر حلقے (wiener circle) کے نام سے مشہور منطقی تجربیت

پسندوں کے سیمینار منعقد کروائے تھے۔ ویانا میں داخل ہونے سے پہلے وہ سپائی نوزا (Spinoza) کے فلسفہ کا گرویدہ تھا۔ بعد ازاں اُس نے تجربی اصول کو اپنایا اور پھر اُسے فلسفۂ زبان پر لاگو کرنا چاہا۔ ۱۹۳۶ء میں قیامِ ویانا کے دوران، اُس نے اپنا مقالہ (Erkenntnis und wissenschaftliches Verhalten) رقم کیا۔ اس میں اُس نے ثابت کیا کہ انسانی افعال بشمول سائنس بطور میدانِ عمل کو معروضی مشاہداتی حوالوں سے بیان کیا جاسکتا ہے، جیسے کہ یہ وظیفہ کسی دوسرے سیّارے پر مقیم کسی ناظر نے کیا ہو جو ہماری زبان سے چاہے نابلد ہو مگر ہمارے ہر فعل سے شناسا ہو۔ کرداری اصطلاحات میں، انسانی افعال کی تفہیم بشمول سائنس کی یہ مساعی جلد ہی ایک طویل تنقید کا ہدف بن گئی۔ اِن مباحث کے دوران، تجربیت پسندانہ فلسفے کی رُو سے، نیئس (Naess) خود تنقیدی کا شکار ہو کر بالآخر ایک متشکک بن بیٹھا۔ بہت سے امکانات اور ممکنہ تناظرات ہوسکتے ہیں۔ افعال کو مختلف زبانوں میں سمجھا جاسکتا ہے۔ اِس آزاد اور روشن خیالی کی وجہ سے نیئس (Naess) نے اپنے عمیق ماحولیاتی (deep-ecological) فلسفہ کا تارَو پود بُنا۔ وہ اِسے "ماحولی حکمت" (eco-sophy) کہا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ ایسے حلقے میں آپھنسا جہاں اُس پر نوجوانی میں چڑھا سپائی نوزا (Spinoza) کے فلسفہ کا خمار، اُس کی ماحولی حکمت میں بھیس بدلے چُغے کی صورت میں نمایاں ہوا۔

اِس دوران میں بہت کچھ ہوا۔ طلبہ کی تیزی سے بڑھتی ہوئی تعداد کے باعث یونیورسٹیوں کی توسیع ہوئی اور وہ ایک سے چار ہوئیں۔ لا محالہ، فلسفیوں کے لیے اسامیاں پیدا ہوئیں اور اپنے اپنے آزاد خیالانہ رجحانات اَپنائے، نیئس (Naess) نے اِس قضیے کو پروان چڑھایا کہ وجودی (existential) اور مظہری (phenomenological) فلسفوں سمیت بہت سے فلسفوں کو ایک ہی پھندے میں پھانسا جاسکتا ہے۔ اِس خیال نے سویڈن کے تقلید پسند تجربی ہمنواؤں کو شدید ذہنی صدمہ پہنچایا۔ اس سب کے نتیجہ میں، ساٹھ اور ستّر کے عرصہ میں، فلسفہ کے حامل ایسے بہت سارے سکولوں میں ناروی فلسفہ عام ہوا، جن کے مابین بہت دلچسپ مباحث ہوا کرتے۔

سقراطی سکجروہیم (Skjervheim)

پیشہ وارانہ سطح پر نیئس (Naess) کی ابتدائی کرداریت پسندی نوجوان نسل کی بے محابا تنقید کا نشانہ بنی۔ اپنے مقالہ از ۱۸۵۷ء "معروضیت اور مطالعۂ انسان" (Objectivism and the Study of Man) میں، ہانز سکجروہیم (Hans Skjervheim) نے اِرادے کے تصور کے بغیر

انسانی افعال کو معروضی طور پر بیان کرنے کی کوشش کو اپنی فیصلہ کن تنقید کا نشانہ بنایا۔ لیکن یہ محض کوئی "دروں خانہ فلسفیانہ تنقید" نہ تھی، جسے ہم زبان کے اثباتی فلسفہ کی مظہریاتی تنقید کہہ سکتے ہیں۔ یہ سماجی علوم کے اثباتی عنصر پر بھی تنقید تھی۔ ایک لحاظ سے، یہ سائنس کی تنقید بھی تھی۔ تاہم، یہ تنقید، سیاسی طور پر موزوں تنقید بھی تھی، یعنی، یہ اُن پیشوں پر بھی تنقید تھی جو باہمی رشتوں کو معروضی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

سکجروہیم (Skjervheim) کرشماتی طرز کا سقراطی (Socratic) فلسفی تھا جو بہت سے علاقوں میں گھوما پھرا تھا۔ اُس کی اپنی سیاسی تنقید کا ہدف معروضی طور پر انتظام واہتمام رَوا رکھنے والے تعلیم سے میڈیا، فلاحی ریاست کے پیشہ وروں سے نَوروشن خیال سفارتی نمائندوں کی آلاتی اور تکنیکی فکر کے رجحان کی طرف تھا۔ بحیثیت سقراطی دانشور، سکجروہیم (Skjervheim) نے فوری اور مقامی بیٹھکوں سے لے کر رسمی دعوتوں اور اجتماعوں، یا، اخباروں اور رسالوں میں بہت طرح کے ٹاکروں اور مباحثوں میں بھرپور حصہ لیا۔

اَرض وثقافت کے تناظر میں، یہ یاد رکھنا بہت ضروری ہے کہ سکجروہیم (Skjervheim) اُن میں سے ایک تھا جس نے وجودی اور مظہری فلسفے جیسے نام نہاد یورپی (continental) فلسفے اور بالخصوص جرمن فلسفہ، گو فرانس سے بھی، تحریکات کو متعارف کرایا۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد بالکل اوائل میں، ناروے کا مغربی ممالک، خصوصاً جرمنی کے ساتھ تعلقات کا نارمل ہو جانا ایک اہم کام تھا۔ لیکن سکجروہیم (Skjervheim) ہی محض اِن رجحانات کو متعارف کرانے والا تنہا آلۂ کار نہ تھا۔ وہ اُن میں سے ایک تھا جو بین الاقوامی سطح پر جرمنی اور فرانس کے یورپی (continental) فلسفے اور انگریزوں کے تحلیلی (analytical) فلسفے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ ناروی فلسفی کئی طریقوں سے یورپی (continental) اور تحلیلی (analytical) فلسفوں کے مابین محاذ آرائی کا شکار تھا۔ ایسے مباحث کبھی ناروے اور کبھی دوسرے ممالک میں چھڑے رہتے۔ اس نسبت سے، یہاں، یہ بات خصوصی طور پر غور طلب ہے کہ جرگن ہابرماس (Jurgen Habermas) اور کارل اوٹو اپل (Karl-Otto Apel) اُن میں سے تھے جو سکجروہیم (Skjervheim) سے بہت متاثر تھے۔

یورپی (continental) اور تحلیلی (analytical) فلسفوں کے مابین تعلق پر مباحثہ میں حصہ لینے والوں میں سے ہمیں، انگیمنڈ گلووَگ (Ingemund Gullvåg) جس نے انسانی افعال کو اپنی عقلیت پسندانہ اصطلاحات کے تجزیے کی رُو سے بیان کیا، نٹ ایرک ترانوئے (Knut Erik Tranøy)، جس نے سائنسی طریقۂ کار کو بنانے والے تشکیلی حصوں کا بڑے قائل کر دینے والے انداز

میں تجزیہ کیا، جیکوب میلوئی (Jakob Meløe)، جس نے مرحوم لڈوگ وٹگنسٹائن (Ludwig Wittgenstein) کے کام پر مبنی نیئس (Naess) کی کرداریت پسندی پر تنقید کا بیڑہ اُٹھایا اور ڈیگفن فولیسدال (Dagfinn Føllesdal) جس نے ہسرل (Hussrel) کے پیدا کردہ مظہری فلسفہ کے ساتھ تحلیلی فلسفہ کو ملایا، ان کا تذکرہ ضرور کرنا چاہیے۔ اس سیاق وسباق میں، ہم اپنے آپ کو میلوئی (Meløe) کے دو بیانات تک محدود کر سکتے ہیں۔ افعال کے غیر معمولی تجزیے کے بعد میلوئی (Meløe) نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ نہ صرف افعال کو کرداری لحاظ سے اُجاگر کرنا نامناسب ہے (جیسے کہ اوائل میں نیئس (Naess) نے کیا) بلکہ یہ بھی ناموزوں ہے کہ اُن افعال میں اِرادوں کو شامل کیا جائے، جن کی توجیہ طبعی حوالوں سے کی جاتی ہے۔ افعال کو محض عالمِ حیات کے علاقہ سے بیان کرنا، (وہ جگہ جہاں افعال حقیقتاً سرزد ہوتے ہیں) ، تب ہی ہم انسانی افعال کی کوئی تسلی بخش صراحت ڈھونڈنے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ اس نکتے کی بنیاد پر میلوئی (Meløe) نے اپنے مظہری تجزیے کو آگے بڑھایا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس نے پہلے ہائیڈیگر (Heidegger) اور پھر وٹگنسٹائن (Wittgenstein) کو ملاکر آگے کی بات کی۔ یہ اس طرح ہواجب کانٹ (Kant) کے طرز کو نقطۂ آغاز کے طور پر استعمال کیا گیا۔ میلوئی (Meloe) نہ صرف صحیح طور پر افعال کی وضاحت پر بلکہ ان گوناگوں افعال کو تشکیل دینے والی ما قبل مختلف حالتوں کی بھی نشاندہی کرنے پر مُصر رہا۔ اِس لحاظ سے گویا، وہ تشکیلی حالتوں کی تلاش میں سرگرداں رہا۔

سیاسی طور پر فعال فلسفی

جیسے کہ سکجروہیم (Skjervheim) نے اپنے گرد نوجوان فلسفیوں اور محققین کو جمع کر رکھا تھا، بعینہٖ جیکوب میلوئی (Meløe) کے گرد اُس کے ہم خیال "جیکوبی" بھی جمع تھے۔ تاہم یہ دونوں گروہ کسی بھی طور پر ایک دوسرے سے بالکل مختلف نہ تھے۔ اور نہ وہ کثرتیتی فلسفیانہ کمیونٹی میں بنے محض ایسے اِکّے میں سے تھے جنھوں نے سر اُٹھار کھا تھا۔ بہر طور، کچھ عرصہ بعد ناروی فلسفہ کئی جہتوں میں بٹ گیا اور جتنا ہم موجودہ زمانے کی طرف بڑھتے جاتے ہیں، اُتنا ہی مشکل ہو جاتا ہے کہ لوگوں اور جہتوں کا تعین کیا جا سکے۔ لیکن اگر ہم دوسری جنگِ عظیم کے بعد کے محض ابتدائی دس برس تک خود کو محدود کر کے جائزہ لیں، وہاں پھر بھی دو خواص اِتنے اُبھر کے سامنے آتے ہیں جن کا ذکر کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ وہ ایسے خواص ہیں جو آج بھی کسی وبا کی طرح ناروی فلسفہ کو شدید طور پر متاثر کیے ہوئے ہیں۔ (الف) ایک جانب سائنسی علوم، بالخصوص انسانی علوم کے ساتھ گہرا قریبی تعلق، (ب) دوسری جانب

سیاسی علوم کے ساتھ گہرا قریبی تعلق۔

ہم نے پہلے نکتے (الف) کو، نیئس (Naess) سے لے کر سکجروہیم (Skjervheim) اور میلوئی (Meløe) تک شروع ہونے والے نظریۂ زبان اور نظریۂ عمل کے متعلق مباحث کے حوالہ سے چھیڑا ہے۔ اور یہاں ہم دوسری باتوں کے ساتھ، جون ایلسٹر (Jon Elster) کی منہاجی فردیت اور اونوندہاگا (Ånund Haga) کی اُس پر تنقید کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔

ہم نے دوسرے نکتے (ب) کو، آلاتی عقلیت پر سکجروہیم (Skjervheim) کی تنقید اور بالواسطہ طور پر نیئس (Naess) کی "عمیق ماحولیات" کے حوالہ سے سمیٹا ہے۔ یہ پوائنٹ ایک اضافی اظہار کا حقدار ہے۔ گو طلبہ کی تعداد کے بڑھنے سے اور ویت نام جنگ کے دوران بہت سے فلسفی سیاسی لحاظ سے فلسفی بن گئے، ناروی فلسفی ابتدائی دور میں بطور فلسفی ہی فعال تھے۔ جب فلسفہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد ناروے میں پھلا پھولا، فلسفیانہ مباحث نازی ازم اور جمہوریت، جنگ اور امن کے مسائل کے متعلق مرکوز ہو کر رہ گئے۔ آرنے نیئس (Arne Næss) نظریۂ جمہوریت پر مبنی یونیسکو (UNESCO) کو پروجیکٹ کا ڈائریکٹر بن گیا، آرلڈ ہالینڈ (Arild Haaland) نے نازی ازم کی وجوہات پر اپنا مقالہ تحریر کیا۔ نیئس (Naess) نے عدم تشدد کی اخلاقیات پر کام کیا۔ (اس میں اُس نے ہندی فلسفہ اور گاندھی کو شامل کیا)، اور ہارلڈ اوفستاد (Harald Ofstad) نے ہماری کمزوریوں کی توہین کے طور پر نازی ازم پر تحریر مرتسم کی۔ ۱۹۶۸ء سے بہت پہلے ناروی فلسفہ سیاسی سوچ بچار کا حامل تھا۔

نام نہاد "مخالف ثقافتیں": کثرتیت کے لیے ایک ضمانت

آغاز میں ہم نے پوچھا، آیا فلسفے میں موجودہ دلچسپی کو محض وقتی جنون نہیں کہا جاسکتا، لیکن آیا جدید معاشرہ کو مصائب کا شکار دیکھا جاسکتا ہے جس کی بدولت فلسفہ میں دلچسپی کی طرف رغبت بڑھی ہے۔ اس نسبت سے، ناروے مستثنیٰ نہیں۔ لیکن ناروے میں فلسفہ غالباً دیگر کئی مغربی اقوام کی بہ نسبت کہیں زیادہ تبدیلیوں سے گذرا ہے۔ ہم نے پہلے ہی یہ واضح کر دیا کہ کیسے اِن میں سے کچھ تبدیلیاں اَبتر سے بہتر پوزیشن میں ظاہر ہوئیں۔ لہٰذا کوئی پوچھ سکتا ہے کہ ناروے میں ایسا تبدل کیوں آیا، اس کا کیا جواز ہے؟ ہر کسی کو ایسے سوالات کے جواب دینے میں محتاط ہونا چاہیے کیونکہ اس میں غالباً کئی عوامل کار فرما ہوتے ہیں۔ تاہم قاری کی دلچسپی کے لیے ہم کو اِن میں سے چند ایک کی آراء پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ شاید ہم اِتنا کچھ، کچھ یوں کہہ سکتے ہیں:

فلسفیانہ سرگرمی سے دیدہ دانستہ اغماض برت کر، جیسے کہ کسی حد تک شیوگارڈ (Schweigaard)

کے لفظوں کو سامنے رکھا جائے، ناروے کے اعلیٰ کارپرداز عملی اور غیر دانشورانہ سوچ کی طرف راغب ہو گئے۔ شاید، یہ تھوڑا افسوسناک ہوا۔ لیکن امور کے کئی پہلو ہوا کرتے ہیں اور یہ صورتِ حال اس سے مستثنیٰ نہیں۔ تمام امور کو مدِ نظر رکھا جائے تو اِسے ایک خوبصورت اتفاق، بلکہ یہاں تک کہ اِس کو دوگنی رحمت کہا جاسکتا ہے۔ پوری انیسویں صدی کے دوران اور بیسویں صدی کے اوائل میں غیر فلسفیانہ اور عملی طرز کے مضبوط اقدام اُٹھانے کے باعث، اعلیٰ کارپردازوں نے بہت سے عمدہ کام کر ڈالے۔ یہ وہ وقت تھا جب دُنیا ابھی بھی سادہ تھی اور اہداف واضح تھے اور قابو میں آسکتے تھے۔ جب دُنیا بتدریج زیادہ پیچیدہ ہوتی چلی گئی اور بالخصوص آخری جنگِ عظیم کے بعد حکمران طبقہ میں دانستاً خِرد و دانش سے چشم پوشی برتنے کے نتیجے میں کم از کم نوجوان اور ناقدانہ سوچ کی حامل نسل کے لیے سوچ و بچار کی حد تک یہ قدرے آسان ہو گیا کہ وہ اپنے موجودہ نظامِ حکمرانی کے خلاف کمربستہ ہو جائیں۔

اِس دوہرے نکتے کو اِس نقطۂ نظر سے تقویت دی جاسکتی ہے کہ ہمارے ملک میں نام نہاد مخالف ثقافتیں ہمیشہ قدرے مضبوط حیثیت کی حامل رہی ہیں، مثال کے طور پر سویڈن میں بھی اِتنی زیادہ مضبوط نہیں رہیں۔ نظریاتی لحاظ سے (کم از کم اب تک ضرور) بہت سے مختلف سیاسی اور ثقافتی کردار ہمیشہ سے موجود رہے ہیں۔ اِس سے فرق نہیں پڑتا چاہے وہ ناروے کی پارلیمنٹ میں ووٹ ڈالنے میں شریک ہوں یا یونیورسٹی کے کسی منصوبہ کے بارے میں منعقدہ مباحثہ میں شریک ہوں، یہ ہمیشہ ہوا کہ متبادل اتحادیوں میں ان کی شمولیت (کم از کم ماضی کی حد تک تو ضرور) رہی۔ لہٰذا، انتہا پسند طلبہ اور قدامت پسند اساتذہ ۱۹۶۰ء کے عرصہ میں یونیورسٹیوں کی جانب تکنیکی جہت کو ہر صورت میں لاگو کرنے کی مساعی کے خلاف باہم محاذ آرائی بنانے کے قابل ہوئے۔ مل جل کر انھوں نے مخالفین کو پسپا کیا۔ (جب کہ سویڈن کی یونیورسٹیاں، یونیورسٹی کی چانسری کو از سرِ نو منظم کرنے میں پھنسی رہیں۔)

مخالف ثقافت اور فلسفہ کے مابین تعلق، بعد ازاں اُٹھنے والی فکر کے لیے قدر و قیمت کا حامل ہو سکتا ہے۔ فلسفے کے لیے بحث و تمحیص کی ضرورت ہوتی ہے، بحث و تمحیص کے لیے کثرتیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ناروی معاشرے میں کئی طرح سے ایک فرقہ وارانہ عنصر ہے، جیسے کہ ہم نے ساٹھ اور ستر کے ماؤنوازوں (Maoists) کی تبدیلی میں دیکھا ہے۔ بہت سے ناروی باشندے دوسروں کو بے عزت کرنے کا رجحان رکھتے ہیں، یعنی وہ انھیں بُرا سمجھتے ہیں، مثال کے طور پر، طبقاتی مخالفین (class enemies)، یا جنس پرست (sexist)، یا نسل پرست (racist)، جو ظاہری طور پر اپنی سماجی پہچان اور ذاتی تشخص کو مضبوط بنانے کا تاثر چھوڑتے ہیں، اور یوں ہماری دقیق جدید زندگیوں کو ایک مخصوص مفہوم بخشتے ہیں۔

تاہم، ناروی معاشرہ ایک خاص سیاسی اور ثقافتی رنگارنگی کو شاملِ حال رکھتا ہے۔ ہم کسی حد تک عادی ہیں کہ رنگارنگ ثقافت کے ساتھ نبھاہ کریں جو ایک خاص سیاسی قوت اور اثر رکھتی ہے۔ بہر طور، ہم کبھی بھی اس ہیئت کو واقعتاً نہیں چنتے۔ کوئی ہماری دوسرکاری زبانوں، مختلف النوع قسموں کے علاقائی جھگڑوں اور فلسفۂ حیات سے متعلق مسائل میں ایسے تناؤ کو دیکھ سکتا ہے۔ ہمیں خود کو اس حقیقت کا عادی بنانا پڑا کہ لوگ مختلف تھے۔ اس حوالہ سے اور ایک ابتدائی سطح پر ہم نے بس یہ سبق سیکھ لیا جو جدید (یا مابعد جدید) معاشرے کے ایک حصہ کو بناتا ہے۔ ایک گوناگوں دنیا میں رہنے کے لیے، کسی کو خارجی تناظرات سے اپنی خود کی دنیا کو دیکھنا سیکھنا ہوگا یا جیسے کہ فلسفی کہتے ہیں کہ خود کی سوچ پر پھر سے غور کرنا ہوگا۔ اس مفہوم میں، سیاسی اور ثقافتی تناؤ اور فلسفیانہ غور وخوض کے درمیان میں شاید ایک دلچسپ رابطہ موجود ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ کامل طور پر ناقابلِ فہم نہیں ہے کہ فلسفہ آخری جنگِ عظیم کے بعد ایک بار پھر چل نکلا، ناروے میں خوب پھلتا پھولتا ہوا دکھلائی دیتا ہے۔

فلسفیانہ حیرت

فلسفہ پھر سے عام ہوا ہے۔ ہم ایک بار پھر سے فلسفہ کی کتابوں کے مطالعہ کی طرف راغب ہوئے ہیں، چاہے ہماری آنکھیں بوجھل اور بھاری کیوں نہ ہو جائیں۔ ابتدائی طور پر بہت سے لوگ اسے فلسفہ کا امتحان (examen philosophicum) دینے کی خاطر پڑھتے ہیں، کیونکہ یہ مطلوب ہوتا ہے۔ ابتدائی طور پر بہت سے "سوفی کی دُنیا" (Sophie's World) پڑھتے ہیں کیونکہ وہ ایسا چاہتے ہیں۔ لیکن معاملات بڑے دقیق طریقہ سے ایک دوسرے میں اُلجھے ہوتے ہیں۔ فلسفہ کا امتحان (examen philosophicum) کے لیکچرز کے بغیر، لیکچرز کے لیے مسودے نہیں ہوسکتے اور فلسفہ کا امتحان (examen philosophicum) کے لیکچرز کے مسودے کے بغیر، جسٹن گارڈر (Jostein Gaarder) بھی شاید فکشن کی صورت میں فلسفہ کی تاریخ نہ لکھ پاتا۔

ہمارے ملک میں فلسفہ پھر سے ترقی کی طرف گامزن ہوا ہے۔ اس وجہ سے، ہم خوشی اور حیرانی محسوس کرسکتے ہیں، جیسے کہ، ہمیں جسٹن گارڈر (Jostein Gaarder) کو مبارکباد دینا چاہیے اور اُس پر خوش ہونا چاہیے۔ لیکن سب سے بڑھ کر ہمیں زندگی اور دنیا.... سوفی کی دُنیا کے ساتھ ساتھ ہماری خود کی دُنیا.... کے بارے میں، حیران کن کھوج لگانا چاہیے۔ یہ تعجب ہے اور رہے گا کہ فلسفہ ہے، نہ صرف مطالعے کے میدان کی حیثیت سے بلکہ اِس حقیقت کے باعث کہ ہم یہاں موجود ہیں، اور جس قدر ہم اِس حیرانی سے دوچار ہوتے ہیں، ہم فلسفیانہ طور پر حیرانی کا شکار رہیں گے، چاہے ہم اسے جان

پائیں یا نہ جان پائیں۔ اور یوں فلسفہ ، جدید معاشروں کے وراثتی بُحرانوں کے لیے محض وقتی طور پر بتدریج کمی کا، یا صرف ہنگامی طور پر مدد کا، باعث نہیں ہو گا۔

ضمیمہ

اگر محولہ بالا غور و فکر سے ہمیں نتیجہ اخذ کرنے کی اجازت ہو تو فلسفہ جدید معاشروں کے لیے ایک سنجیدہ معاملہ رہے گا، اور ناروے میں اس کی صورتِ حال نسبتاً ایجابی رہی ہے۔ اگرچہ اس کے مستقبل کے بارے میں بہت سے سوالات اُٹھانے کی گنجایش ابھی بھی موجود ہے۔ ایک سنجیدہ فکر و نظر رکھنے کی حیثیت سے، ہم ناروے میں فلسفہ کے رتبہ سے متعلق ممکنہ سلبی رُجحانات اور ذو معنویت کے بارے میں چند ایک ریمارکس کا اضافہ کرنا پسند کریں گے، لیکن یہ چبھتے ہوئے سوالات ہیں اس لیے ہمارے ریمارکس اسی مطابقت سے پڑھے جائیں، یعنی کہ انھیں عارضی مشورے خیال کیا جائے۔

اِسے یوں پیش کرتے ہیں: دوسری جنگِ عظیم دوم کے بعد ناروی فلسفہ کی قدرے بہتر حالت کو عیاں کرنے کی غرض سے، کوئی بھی یونیورسٹی سطح پر لیے جانے والے لازمی کورسز، جیسے فلسفہ کا امتحان (examen philosophicum)، عوامی جگہ میں اور سیاسی ثقافت میں فلسفیوں کی شمولیت، اور مختلف علوم بشمول سوشل علوم اور علومِ فنونِ لطیفہ سے قریبی تعلق کا حوالہ دے سکتا ہے۔ لیکن اِن سوالوں کی ذو معنویت اِن عوامل کے ساتھ پہلے سے ہی اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اِن میں سے ہر ایک کچھ تھوڑی بہت تبدیل شدہ شرائط کے تحت، تائیدی کی بجائے تخریبی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ یہاں، میں اجمالاً بیان کروں گا کہ ایسی صورت کیونکر ہو سکتی ہے۔

(الف) فلسفہ کا امتحان (examen philosophicum) نے بہت سی اسامیاں نکالی ہیں اور ابھی تک نکل رہی ہیں۔ اور یہ ناروی فلسفہ کے لیے ایک مستحکم بات ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک خطرہ ہمیشہ لاحق رہا ہے کہ یہ توسیعی تعلیمی فرائض، تعارفی سطح پر اور طویل المیعادی نقطۂ نظر سے، کسی حد تک منضبط ثابت ہوئے اور یوں تخلیقی اور حقیقی تحقیق کی قدرے نظر اندازی پر منتج ہوئے۔ یہ ورثی خطرہ ماند نہیں پڑا، خواہ یونیورسٹی کا نظام اشرافی سے عوامی ادارے میں تبدیل ہوا اور اُسی وقت تعلیمی طریقۂ کار میں بھی تبدل آیا جہاں لیکچرز سے ہٹتے ہوئے سیمینارز اور نجی ٹیوٹوریلز کی طرف زور دیا گیا۔ ایک امکانی مستقبل کا منظر نامہ، عوامی تعلیم کی نئی تعلیمی اصلاحات کے زیرِ اثر فلسفہ کا امتحان (examen philosophicum) کے باعث، اپنی پرانی اقدار میں کمی کو مد نظر رکھے جانے میں سے ایک ہے۔

(ب) ناروے ۴.۵ ملین آبادی پر مشتمل ایک چھوٹا سا ملک ہے اور عام طور پر کہا جاتا ہے کہ

یہ نہ صرف سماجی معاملات میں، بلکہ کسی حد تک ثقافتی اور فکری اعتبار سے بھی، ایک غیر طبقاتی آئیڈیالوجی کا حامل ہے۔ یہ گھمبیر سوالات ہیں لیکن تھوڑے بہت جواز کے ساتھ ہم ناروے کو بطور قوم اس خاصیت میں شمار کرسکتے ہیں کہ جو اپنی تعلیمی منصوبہ بندیوں میں درجۂ اوسط کو بڑھانے پر اپنی توجہ مرکوز رکھتی ہے۔ مگر جب فکری حاکمیت کا سوال اُٹھتا ہے تو ناروے قدرے کم عزائم کا ملک نظر آتا ہے۔ اور یہ غیر طبقاتی آئیڈیالوجی ذریعۂ ابلاغ کی سنسنی خیزی کی طرف بڑھتے ہوئے، موجودہ رُجحان سے مداخلت کرتے ہوئے معلوم ہوتی ہے۔ ٹیلیویژن اور اخبارات اب مختلف سیاسی جماعتوں سے اتنے زیادہ وابستہ نہیں رہے، مگر مارکیٹ میں ایجنٹ کے طور پر کام کرتے ہیں۔ اسی کے مطابق، طرز اور مواد بہت بدل چکا ہے۔ مختصر عبارتیں، زیادہ جاذبِ نظر تاثرات، زیادہ تصاویر، قدرے زیادہ شخصی تاثر اور تھوڑا بہت تحلیلی اور منطقی رنگ، یہ نیا پن آزاد خیال دانشوروں کی بجائے پیشہ وارانہ صحافیوں کے لیے ایک کار گاہ بن چکا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ سیاسی جماعتیں انتخابی مہمات اور جُزوقتی جمہوری ملکیت کی سمت میں بڑھتے ہوئے شکست وریخت کا شکار ہوئی ہیں، جب کہ اسی کے ساتھ عوامی سطح پر سیاسی مباحثوں میں بھی فرق پڑا ہے۔ یقیناً یہ عمومی رُجحان ہے جو پوری دُنیا میں اُبھرا ہے لیکن غیر طبقاتی آئیڈیالوجی کے حامل اِس چھوٹے سے ملک میں ایسے رُجحانات زیادہ قابلِ امتیاز عوامی ماحول کی حامل بڑی اقوام کے مقابلہ میں زیادہ نقصان دہ ہیں۔ فلسفیوں کے لیے یہ رُجحانات ایک مخصوص چیلنج ظاہر کرتے ہیں جہاں فلسفیانہ نکات اور استدلالات عام طور پر ہیجانی اور چٹ پٹے متصور نہیں کیے جاتے۔ آج کل یہی رُجحانات روزمرہ کے سنجیدہ تبصروں اور شماروں میں نظر آتے ہیں۔ روایتی طور پر، فلسفہ اور بہت سے دوسرے سوشل علوم اور انسانی علوم بھی، صرف تعلیمی درسگاہوں میں رفقا (fellows) سے وابستہ نہیں رہے بلکہ عوامی ماحول میں عام لوگوں سے بھی وابستہ ہوئے ہیں۔ جس حد تک، کاروباری ذرائع ابلاغ نے عوامی فضا کو بدلا ہے، اُسی حد تک فلسفے کی توسیعی فضا کے بنیادی پہلو کو بھی بدلا ہے۔ اس سے بھی زیادہ بُرا اب اس بات کا خطرہ ہے کہ فلسفہ اور عمومی طور پر انسانی علوم، داخلی لحاظ سے ذرائع ابلاغ کے ان نئے رُجحانات کی زد میں آسکتے ہیں۔ فکری بصیرت اور اظہار کو رخصت کرنے سے خود ان علمی شعبہ جات پر حاوی ہوسکتے ہیں، اور یوں غیر اہم اور غل غپاڑہ کی صورت بن سکتے ہیں۔

(ج) دوسرے شعبوں کی طرح فلسفہ کو ذاتی پیشہ وارانہ تشخص اور کچھ ادارتی ہیئت کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی فلسفہ کو عوامی سطح پر پھیلانے کی ضرورت ہے اور اسے دیگر شعبوں کے رفقا کو بھی منتقل کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ خطرہ ہے کہ مبادا فلسفہ تنہا نہ ہو جائے۔ لیکن اگر ذرائع ابلاغ اور بعینہ دیگر

انسانی اور سوشل علوم سنسنی خیزی کی طرف مائل ہوئے، تو اِن شعبوں کے ساتھ ثمر آور روابط کو بھی گزند پہنچے گا۔ (میرے خیال میں، پسِ جدیدیت کے کئی رُجحانی پہلو اِس کی صراحت کر سکتے ہیں۔)

یہ تین نکات جدید معاشروں کو حسنِ اتفاق سے ایک مخصوص خطبہ کے طور پر ناروے جیسے ایک چھوٹے اور غیر طبقاتی معاشرے کی حالت کو درپیش کچھ چیلنجز کے بارے میں چند ایک اہم ریمارکس کی محض نشاندہی کرتے ہیں۔ لیکن وہ ایک یادداشت کے مصداق اعانت کرتے ہیں۔ ایجابی رُجحانات کو بآسانی سلبی رُجحانات میں بدلا جا سکتا ہے۔ ہمارا ناروی فلسفہ کے بارے میں محولہ بالا بیان، جو کئی اعتبار سے ایجابی اور رجائی تاثر کا حامل ہے، حرفِ آخر نہیں ہونا چاہیے۔ یقیناً کچھ اور تھوڑے بہت قنوطی پہلو ضرور ہیں، جو اِس منظر نامے میں ڈالے جا سکتے ہیں۔ بہر حال، مستقبل میں کیا ہو سکتا ہے، اِک کھلا سوال ہی رہتا ہے۔ اسے مستقبل کے لوگ ہی جان پائیں گے۔

❁ ... ❁ ... ❁